
کالے نہنگ
رضی حیدر گیلانی

کالے نہنگ

رضی حیدر گیلانی

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

پرنٹ لائن

انتساب

ہر اُس لفظ کے نام جس کی ندا نے مجھے مجھ تک پُہنچایا
ہر اُس بحر کے نام جس نے میرے زخموں سے لے کی شراب کشید کی
ہر اُس چاہ کے نام جس کے جلتے پروں سے میری نظموں کو دھواں ودیعت ہوا
ہر اُس درد کے نام جس کے سرہانے میرے قلم کے منہ کو خون لگا
ہر اُس رات کے نام جس کی کلونچ کے گربھ استھان سے
میں نے نئے استعاروں کو جنما
ہر اُس بوس کے نام جس نے میرے ہونٹوں کو پتھرایا
ہر اُس لمس کے نام جس نے میری ٹھنڈی رگوں میں آتشیں روح پھونکی
ہر اُس لمحۂ سرمستی کے نام جس کی یاد میں مجھے کالے نہنگ سمندر کی تہ تک لے گئے
اور میں نے کائی کے ستونوں پر کھڑے سمندر کے محل کو دیکھا

ورق ورق

پابند و آزاد نظمیں

نثری نظمیں

تعارف

روائتی شاعری کی ضرر رسانی پر بات بہت کم ہوتی ہے۔ شاید یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ آیئے اعتراف کریں کہ ہماری روائتی اُردو شاعری کا بڑا حصّہ زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور تنگ و تاریک گوشوں سے کترا کے گذر جاتا ہے۔ زیادہ تر مرّوجہ شاعری چند مقبولِ عام موضوعات کا طواف کرتی ہے۔ کیا شاعری صرف جمالیاتی عیّاشی کا نام ہے؟ بعض منچلے تو یہ کہتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے کہ مصرع سازی تو موضوع کی غیر موجودگی میں بھی عین ممکن ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زُمرہ کی شاعری بھی کچھ ایسی ہی تحدید کا شکار ہے۔ سہل انگاری کا یہ عالم ہے کہ قاری اور تخلیق کے درمیان تجرید کا پردۂ دُود (Smoke screen) اُٹھا دیا گیا ہے۔ مغرب کے برعکس ہمارے ہاں Dark Romanticism یا Gothic Fiction کو وہ قبولِ عام حاصل نہیں ہو سکا جو اس کا حق ہے۔

آیئے! ایک ایسے شاعر کو پڑھیں جو مروجہ رجحان سے کنارہ کش ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جو پہلے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور ردِعمل پوری گمبھیرتا کے ساتھ زینتِ قرطاس کرتا ہے۔ شاعر کا نام ہے ’رضی حیدر گیلانی‘ اور کام کا نام ہے ’کالے نہنگ‘۔ یہ کتاب اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر وحید احمد

راولپنڈی

پیش گفتار

یہ اعلان شاید غیر ضروری ہو گا کہ یہ کتاب میری سالوں کی عرق ریزی کا نچوڑ ہے۔ میں نے اپنی کم عقلی میں جو سوچا، جو محسوس کیا ، اُن سوچوں اور احساسات کی مجسمہ سازی کرنے میں لگا رہا۔

بھرت مُنی کی کتاب 'ناٹیہ شاستر' کی نظر سے دیکھیں تو اِن نظموں میں آپ کو شرنگار رس کم کم اور رَودر، وِبھتس اور بھیانک رس کثرت سے دکھائی دے گا۔ اُردو ادب میں لطافت پر بہت زور دیا گیا ہے۔عموماً جنگ کے میدانوں میں بھی نظموں کا کیمرا اس ہولناکی سے پرے رکھا جاتا ہے جو انسانی کرودھ سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر شاعری کا بنیادی قضیہ Immanuel Kant کی Ding an sich یعنی Thing in itself کی تصویر کشی ہےتو زندگی کا یہ دوسرا چہرہ دنیا کو نہ دکھانا بے شرفی اور دغا بازی ہے۔ Saturn اگر اپنا بچہ کھا رہا ہوتو میرے نزدیک Francisco Goya کی مشہور تصویر Saturn devouring his son ایمان داری کا مرقع ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اسی قصے کی عکاسی کرتی Peter Paul Rubens کی معروف پینٹنگ Saturn نادرستی ہے۔ ایک ایسے باپ کی شبیہ، جو اپنے بچہ کو کھا رہا ہو ، کس طرح خوبصورت اور متوازن خطوط پر مبنی ہوسکتی ہے؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔

اِن نظموں میں آپ مابعد جدید زندگی کی تنہائی، بے یقینی اور بے معنائی پائیں گے۔ اگر آپ زندگی کا جشن اُس کے جملہ ننگ و عیوب کے ساتھ منانا چاہتے ہیں تو یہ نظمیں پڑھیے، اگر آپ اِس اندوہناک تذکرے کو کیتھارسس سمجھ کر جینا چاہتے ہیں تو یہ نظمیں پڑھیے۔

اِن میں سے بیشتر نظمیں دل میں پڑھنے کے لیے نہیں بہ آوازِ بلند پڑھنے کے

لئے لکھی گئی ہیں، اِنہیں David Lynch یا Andrei Tarkovsky کی کسی فلم کی طرح دیکھیے۔ ریڈیو پر چلتے Mozart کے کسی آپرا کی طرح سنیے۔کسی اسٹیج پر کھڑے ہو کر میٹل گٹار کے شور میں لوگوں کو سنایئے۔ یہ کالے نہنگ سمندر کی تہ تک آپ کو کھینچ لینے کے منتظر ہیں۔خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

میں فائزہ زیدی صاحبہ اور عمر عزیز صاحب کا بے حد ممنون ہوں جن کے مشوروں اور کمک نے اِس کتاب کی طبع میں میری بہت رہنمائی کی۔ ڈاکٹر وحید احمد صاحب اور منوج متل صاحب کا بھی بے حد سپاسگزار ہوں جن کے شفیق اور حوصلہ افزا تبصروں نے میرا بہت دل بڑھایا۔کتاب کا سر ورق ایرانی آرٹسٹ مہسا عربی صاحبہ نے ڈزائن کیا، ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

آخر میں یہ کہتا چلوں کہ شمس الرحمن فاروقی صاحب، پروفیسر فرانسس پریچٹ صاحبہ، پروفیسر سلیم کمال صاحب ، بھرت منی ، ارسطو، آرتھر شاپنہاور کی کتب اور تبصروں نے مجھے شعری جمالیات کو سمجھنے کا رستہ دکھایا، اِن اساتذہ کا جتنا شکریہ کیا جائے کم ہے۔

خاکسار

رضی حیدر گیلانی

ایک آغاز

میں نے ضرورت سے زیادہ چشموں سے باتیں کی ہیں، قطروں کی ہنسی کو چھوا ہے، سرسراتی ہوا کی اُداسی کو گھنٹوں چکھا ہے۔ میں سچ سن چکا ہوں، وہ سچ جو قبروں میں مقید مُردوں کو سنائے جاتے ہیں۔ وہ سچ جن کی تجلی زندوں کی حسِ سامعہ کو سُرمہ کر دے۔ تو پھر یہ سچ مجھے کیوں سنائے جا رہے ہیں؟ میں تو زندہ ہوں۔۔۔کیا میں زندہ ہوں؟؟

میں گر رہا تھا، کالے بادلوں سے بارش کے قطروں کے ساتھ۔ میں بھی ایک قطرہ تھا خون کا، ایک لوتھڑا، ایک جنین، بچہ دانی کی تلاش میں۔ مگر جس بچہ دانی میں مجھے جگہ ملی وہ خاردار تاروں سے گھری تھی۔ جس کے باہر بندوق بردار لمبے قد اور داڑھی والے، پہرہ دار پہرہ دے رہے تھے۔ یادداشت کے خالی رخنے تخلیق کیے جا رہے تھے، جہاں چالیس سال بعد میں اپنی تخلیق کے بوسیدہ پنے کھودنے آؤں گا۔ میرے خاکی دل میں آسمانوں کے وہم پروئے جا رہے تھے جہاں چالیس سال بعد ایک شگاف ہو گا، کالے بادلوں میں گھرا ۔۔۔ میں زبانوں کے اُس بدنصیب شہر میں پیدا ہوا جہاں چُپ کا دریا بہتا تھا۔

''حقیقت وہ شام ہے جس کا ڈوبتا سورج گگن کے چہرے پر اپنی سرخ پیک تھوک کر نہاں ہوتا ہے۔ تُف ہے تمہارے پندار کی پنہاں داریوں پر، اپنی خام خرد کے حُن حُنے سن رہے ہو؟ سورج ڈوبا نہیں کرتے، تم ڈوب رہے ہو!''

میں بڑبڑایا

سک سک سک

ادھورے کمرے کا پنکھا، جو تیزی سے چل رہا تھا، جس کے مخلوط پروں پر سرخ ساڑھی پہنے ایک عورت کا خاکہ بنا تھا، رُک گیا اور وہ خاکہ تین حصوں میں بٹ گیا۔ میں جو خاموشی سے چارپائی پر لیٹا اپنی تخلیق کے سحر میں محصور تھا، بجلی جاتے ہی دنیا میں واپس آ گیا۔

میرے کمرے کی دیواروں پر بلیک اینڈ وائٹ تصاویر آویزاں تھیں جو میں نے پچھلے کئی سالوں میں کھینچی تھیں۔ہا! بے معنی تصاویر!۔ اب مجھے اُن سے کوئی لگاؤ باقی نہیں رہا تھا۔ میں اُن کا اِتنا عادی ہو چکا تھا کہ اُن کے فریمز کے اندر سے دیوار کے اُکھڑتے پینٹ کو دیکھ سکتا تھا۔

بلڈ پریشر مشین کا پارہ جو ہر رات میری شریانوں کی طُغیانی پر کان دھرتا، چڑھے جاتا اور سرگوشی کرتا کہ مورکھ ! سوالوں سے کہہ دے کہ رات کی چادر اوڑھ کر سو جائیں یا اُنہیں کسی پیٹی میں بند رکھ ، اور مغز میں فروعی عادتوں کی غلاظت بھر!۔ زندگی اور اُس سے متصل تمام محرکات بے معنی ہیں، اِس شعبدہ بازی کو شیڈو باکسنگ سمجھ، تیرا ہی خرخشہ، تیری ہی خصومت ، سو خود تجھی کو خود سے لڑنا ہے۔ لال بوشٹیں پہنے یہ بود اور نبود کے بونے ہمیشہ ناچتے رہیں گے ، اُنہیں صرفِ نظر کر دے۔

خفقان کسی نہنگ کی مانند سمندر کی تہ میں میرے محزون دل کو نوچ کھانے میں مصروف تھا۔

''جبلت، خصلت کیسے بھونڈے الفاظ ہیں'' میں نے سوچا۔

پر حقیقت جتنی بھونڈی ہو اتنی ہی یقینی ہوتی ہے۔ میں زندگی کے تجربے کو پھوکل دلائل سے بھر دینا چاہتا تھا، پر زندگی کے ارادے جسے شوپنھاور نے 'وِل آف لائف' کہا تھا اس سے کہیں زیادہ پختہ تھے۔

''زندگی ایک پچھل پیری ہے'' میں بڑبڑانے لگا،

''جو روحیں نگلنے پر قادر ہے۔''

''ہم بھاگ رہے ہیں اور بے لاگ بھاگ رہے ہیں، شورہ پشت بونے، گنبدِ

دود گشت کے برجوں کو تسخیر کرنے کے خواہاں اور خود کی رمیدگی سے مُسَخر ۔۔۔ پَپڑی جمے ہونٹوں پر لالیاں لیپنے والے، سوختہ گالوں پر غازہ تھوپنے والے ۔۔۔ تُف ہے ہم پر''۔میں ہنسنے لگا۔

ڈاکٹر عالیہ منّنجائٹس کے مرض میں مبتلا مجھ بیچارے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں مسکراتا، بڑبڑاتا مریض اس کے لئے بو العجب نہ ہوتا اگر میں نے اپنی بیوی کی ساڑھی پہن نہ رکھی ہوتی، اپنے پھٹے ہونٹوں پر اُسکی لِپ اسٹک لیپ نہ رکھی ہوتی۔

جلال لالہ جنریٹر چلا آیا تھا اور پنکھا گھومنا شروع ہو گیا تھا اور اُسکے تین پروں میں بٹے ہوئے لال خاکے نے پھر ایک لال ساڑی میں ملبوس عورت کی شکل ڈھال لی تھی۔ وہ نظمیں جو کبھی نوجوانی میں میں نے لکھیں، مینِنگو کوکس کے جرثوموں کے ساتھ برہنہ ناچ ناچ رہی تھیں۔

ڈاکٹر عالیہ نے جلال لالہ کو میرے سر اور گھٹنوں کو جوڑ کر سختی سے پکڑنے کو کہا۔ اور ایسا کرتے ہی سرنج میری ریڑھ کی ہڈّی کے مُہروں میں انجیکٹ کر دی، پِسٹَن کھینچتے ہی رقص کناں جرثوموں کا ایک غول ٹیکے میں بھر گیا۔

''ترے بغیر مری نیند کے صفحوں پر،
خالی قلم سے خاموش نظمیں لکھی گئیں
نِب میری کھال کی پپڑیاں اُتارتی ہے
مجھے ہر استعارے میں اپنا لاشہ دکھائی پڑتا ہے
ہر کنایے کے ناخن میری ہی قبر کھودتے ہیں
میری ہی جِلد کھروچتے ہیں''
جرثومے میری نظموں کا ورد کر رہے تھے۔

ڈاکٹر عالیہ نے جلال لالہ کو بتایا کہ بیماری کی علامتیں گردن توڑ بخار کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور یہ بخار جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

جلال لالہ نے کھنگارتے ہوئے کہا :

''ڈاکٹر صاحبہ برا نہ مانیں تو عرض کروں، ہمارے والد بہت بڑے حکیم تھے،

وہ اخوینی بخاری صاحب کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، سنا تو ہو گا بخاری صاحب کے بارے میں آپ نے ؟۔۔۔ بڑے حکیم ہوئے ہیں وہ ۔۔۔مالیخولیا کے بارے میں بخاری صاحب کی کتاب میں ذکر ہے بابا کہتے تھے ، ایک اَن دیکھا ڈر، ایسے سوالوں کا دل میں اُٹھنا کہ جن کے جواب نہ ہوں، خود پہ ہنسنا، خود پہ رونا، بے وجہ بڑبڑانا، یہ سب تو ہے اِن کو، ورنہ کون پہنتا ہے اپنی بیوی کی ساڑھی، لپ اسٹک لگائی ہے دیکھو'

اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ میرے پاس آیا اور میرے ہونٹوں سے لپ اسٹک اتارنے لگا۔ ڈاکٹر عالیہ نے بوڑھے جلال لالہ کی بات سنی اَن سنی کر دی۔

''کل تک ٹسٹ کے رزلٹ آ جائیں گے۔ میں انٹی بائٹک لکھ رہی ہوں فوراً لائیے۔ اگر صبح تک حالت بہتر نہ ہو تو فوراً ہسپتال داخل کیجیے۔ میں صبح راونڈ پر ہی ہوں گی، مجھ سے آ کر ملیے گا۔ میں بتاؤں گی آگے کیا کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر عالیہ نے اپنی سٹیتھو سکوپ اُٹھائی اور باہر کو چل دی۔

خاموشی کا سفید شور، میرے کانوں کے پردوں کو ہزاروں ٹڈیوں کی مانند کتر رہا تھا کہ اخوینی بخاری ابوحکیم نے میرے کان میں سرگوشی کی

''السوداء ۔۔۔ السوداء ۔۔۔ السوداء''۔

اور مجھ سودائی کی تلی سے بلیک بائل کا اِس قدر اِخراج ہوا کہ ایک اِستخر بن گیا۔ اور میں اُس بلیک بائل میں ڈوبنے لگا۔ ابن سینا کی کتاب 'القانون فی الطب' کے صفحے خود کو جگتی چھند میں بڑبڑانے لگے۔ چھند کے 48 اکشر میری ناف سے نئی نال بُن رہے تھے، میں ایک جنین بن گیا تھا، ایک فیٹس، کہ پھر اچانک، لوگوں کے قدموں کی آوازیں طبلے کی تال بن گئیں۔

''گھے نا، دھاتی، دھا، دھا، تن نا''

راگ لِلت ہسپتال کی اُس صبح کے کشکول میں ریزگاری بھرنے لگا۔

ایک رُکی ہوئی چیخ ہوا میں معلق تھی جیسے سیاہی کی بوند پانی میں لٹک رہی ہو۔ نگار نے، جس کے دائیں گال پر ایک کالا آنسو چمک رہا تھا، درد بھرے لہجے میں کہا

''میں جا رہی ہوں''۔

اور اس کے جاتے ہی میں خاموش ہو گیا۔ یوں میں خاموشی کے خالی گلاس میں مقید تھا، مقید ہوں۔ وائن کی بوتل آدھی ہو چکی تھی اور میں شعر بڑبڑا رہا تھا۔

''اُس کو کیسے نکالیے دل سے
ہم کہ دل ہی نکال بیٹھے ہیں
دل سے مُردوں کے خون پینے کو
کچھ گِدھوں سے ملال بیٹھے ہیں

محبتیں بھلائی جا سکتی ہوں گی، عادتیں نوچ کھاتی ہیں۔ ہم خود کو محبتوں اور عادتوں کے رخنوں میں بھرتے ہیں۔ اور ایک دفعہ یہ رخنے بھر جائیں تو ان سے نکلنا محال۔'' میں بڑبڑانے لگا

''وائے عادتیں !! اور حیف ان کے رخنے !!جن کی غلام گردشوں میں آدم زاد برہنہ مقید ہیں''

''کیا بکتے ہو، کیوں بگھارتے ہو۔۔۔ خاموش!
تمام یاوہ گویان ساکت کنید !
تمام ہرزہ گویان خفہ شوید !''

میرے لئے عالیہ کی آواز کسی شور سے زیادہ نہیں تھی، میری اُن تصویروں کی طرح، جن کے اندر سے میں اُکھڑتے پینٹ کی پپڑیاں دیکھ سکتا تھا۔ یہی نہیں میں اپنی لال آنکھوں سے کئی سال آگے اور کئی سال پیچھے دیکھنے پر قادر تھا۔

''خاموش!!! خاموش!! سفید شور خاموش!!!''

میں نے کئی سال بعد یا کئی سال پہلے پر نظر کی، تو دیکھا کہ ایک زمیں دوز غار سے بارہ سنگھے یکے بعد دیگرے نکل رہے ہیں۔ اور پھر میں خود نکلتا ہوں۔ میں خود ایک بارہ سنگھا بن چکا ہوں۔ اچانک ایک ہیجانی گرم چیخ میرے دل میں داغ دی جاتی ہے، میں کراہ رہا ہوں۔ لہو آہستہ آہستہ میرے پیٹ سے نکل رہا ہے اور میرے نافے سے نکلتی مُشک سارے میں پھیل رہی ہے۔

الیعازر مر گیا

بلب کا جبڑا کھلے ، آگ برس جائے تو ؟
گر یہ اِستخر ابھی ، خون سے بھر جائے تو ؟
یا یہ اِستخر
(جہاں آب کے منشوروں سے
رنگِ ہستی سے فنا کی یہ دھنک اُبھری ہے)
کوئی اِستخر نہ ہو ، کوکھ ہو میری ماں کی
اور میں میں نہیں ، شاید وہ اُچھلتا پانی
جس نے سانسوں کی طنابوں کو پکڑ رکھا تھا
وائے قسمت کہ مرے ہاتھ میں رسی نہ رہی!!
آہ میرا یہ جنیں خون اُگلتا جائے

اِستخر: فارسی میں سویمنگ پول کے لئے استعمال کیا جانے والا لفظ

اِس قدر خون مری ماں کا بطن بھر جائے
اِس قدر خون کہ سرجن کا لبادہ میرے
سرخ ایام کی تنہائی سا گاڑھا ہو جائے
اور تانبے کے کسی گرم سے برتن میں ابھی
میرے لاشے کے کٹے لخت پڑے ملتے ہوں

بلڈ کینسر

یہ نظم ایک مرتے ہوئے بارہ سالہ بچے کی دنیا ہے جس کی رگوں میں کیموتھراپی کے محلول دوڑ رہے تھے پر اُس کے خوابوں کے کردار مردنگ کی تھاپ پر ناچتے، وہ سپہ سالار بھی تھا اور ایک خلاباز بھی۔ دور اُفُق پر اس کی موت کے رنگ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

یہ اُن زمانوں کی داستاں ہے
کہ جب خرد کے کثیف پنجوں نے
میرے سنبل پروں میں ناخن نہیں کھبوئے تھے
اُن زمانوں میں سپنے سانپوں کے بِل نہیں تھے
اننت ناگا کی جھڑتی چمڑی سنپولیوں کا خدا نہیں تھی
گگن کا کیسر گِدھوں کا لقمہ نہیں بنا تھا
ہمارے صورت گروں نے الٹے عمیق غاروں کو سیدھ دیتے
پلید چمگادڑوں کا چہرہ نہیں تکا تھا
اگرچہ کینسر کے زرد کیڑے رَجَز کی لے پر تھرک رہے تھے
میں اپنے دل کی لگام تھامے،

گُلاہ خود میں سے جھانکتا تھا
سو میری نبضوں کے ہنہنانے سے زرد کیڑوں میں خوف قائم تھا ،
پر اچانک ۔۔۔
سفید کوٹوں میں بند سرنجوں نے میری دھڑکن پہ کان رکھے
یوں تیز دانتوں سے میرے کولہے کی ہڈی میں نقب کھودی
کہ شاہ پورس کے مست ہاتھی نے اُس کی فوجوں کو روند ڈالا
سفید خلیوں کے شہسواروں نے شہبا دُلدُل کی پیروی میں
سپر اٹھائی،
نیام سے تیغ کو نکالا،
تو زرد کیڑوں نے اپنے نیزوں پہ خونی صفحے اٹھا لیے تھے
میں مر رہا ہوں ، سسک رہا ہوں
یہ میرا بستر ،
(جہاں میں بے سدھ پڑا ہوا ہوں)
مری چِتا ہے
سو میرے ہاتھوں میں میرے بالوں کے جلتے گچھے ہیں
میرے ڈھانچے کے رقصِ آخر کو دیکھنے
یہ سیاہ کپڑوں میں کون بڑھیاں ہیں ؟
کیا بڑبڑا رہی ہیں ؟
اِنھیں اٹھاؤ!!
کھجور کی گٹھلیاں ہٹاؤ!!

گُلاہ خود: فولاد یا آہن سے بنی جنگی ٹوپی، شہباء یا شہبا: خاکستری رنگ مائل بہ سیاہی

یہ خونی تھیلے میں کس کا خوں ہے؟

لہو کے قطروں کا ورد روکو !!

یہ ورد آنتوں کو کاٹ کھاتے ہیں

اور مثانوں کو چاب جاتے ہیں

یہ رقصِ آخر ، آخری نہیں ہے

میں اک جوالا مُکھی کا قصہ ہوں

میں انفجارِ عظیم کی طاقتوں میں ذَرّہ ہوں

میں ملکی وے کی سفید راہوں میں زرد سورج کے آشیانے میں رہنے والا

گو جل رہا ہوں، جلا نہیں ہوں

میں مر رہا ہوں، مرا نہیں ہوں

دوام

کھلے ہوئے گلاب رُخ
ہرے بھرے جوان تن
دراز پیڑ وقت کی زمین پر کھڑے ہوئے
پرکاش کی تلاش میں امید سینچتے ہوئے
لہک چہک فضاؤں میں
دمک رُواں رُواں
دل اور جگر تپاں تپاں
دہکتی شوخ حسرتیں
ہر ایک مس گمان،
گدگدی میں میل کی اُمنگ

پرکاش: نور، چمک، روشنی، شوکت، ظہور

ہونٹ کے نشان

آن آن گردنوں پہ نور کے

خوشبوئیں نَفَس نَفَس

زُلالِ خضر کی مٹھاس

دوام تھا قدم قدم ۔۔۔

کہاں گئے ؟

دم آ نہیں رہا

دم آ نہیں رہا،
نَفَس نَفَس گھٹن، قدم قدم تھکن
جلے ہوئے پر آسماں سے گر رہے ہیں
کباب ہو گئے ہیں کیا
پرکاش کے سَوَپُن دیکھتے پرند
ٹھٹھر رہے ہیں زمہریر مردہ گھر میں دو دراز جسم
لبوں پہ پھیپھڑی بندھی ہوئی
اُتر رہا ہے آنکھ میں سفید موتیا
دلوں کے سگ گلی میں بھونکتے ہیں
ڈھونڈتے ہیں دامن آشنا مسافروں کے

پرکاش: نور، چمک، روشنی، شوکت، ظہور، سَوَپُن : سپنا ، پھیپھڑی بندھنا : پَپڑی جمنا

سونگھتے ہیں پریت کی مہک
تھکن سے بیٹھتے ہیں ہار کر
کُریدتی ہے خواب کی چڑیل
قبر سے نکالتی ہے داغ داغ دھڑ
کھروچتی ہے رات بھر کبود جلد
یہ خلفِشار
جسم کے اُجاڑ مَرغزار میں کسی پرند کی پُکار
درخت ڈھے چکے،
سبھی پشو پکھیرو جا چکے
یہ آخری پرندہ کون ہے
ہُما یا میں؟
یہ کون ہڈیاں چبا رہا ہے
دل کا ماس کھا رہا ہے
سینہ ریگزار
غموں کے اندھکار میں اٹے نگر
یہ دل ہیں یا ہیں ریت میں دھنسے ہوئے کھنڈر

پشو: چوپایہ، ڈھور، جانور، پکھیرو: پرندہ

اوپن ہارٹ سرجری

پہلی آواز (غصیلی، گرجتی):

'دیکھیو مت کھولیو اِس وِش بھرے موذی کا منہ
دیکھیو اِن راستوں میں جل بجھے گی روشنی
آسماں کے جسم، اُودے جسم سے، رسنے لگے گی پیپ بھی'

دوسری آواز (ڈرتے ہوئے، سرگوشی):

'اِس کی دھڑکن ہی سے چلتی ہے زماں کی نبض۔۔۔'

پہلی آواز (غصیلی، گرجتی):

'۔۔۔ اور تیری زباں، چُپ!!
زمہریری سانس اِس کی عصرِ یخبندان لے آئے گی گیتی پر
مت کھولیو
مت کھولیو

عصرِ یخبندان : آئس ایج

دیکھنے کو میرا سینہ ، ہے دراصل اِس کی کچھار
جس کی ڈھلوانوں کے دلدل لوتھڑے ہیں خون کے
جس پہ اُگ آئیں ہیں خود رو جھاڑیاں کچھ سانس کی
گھات میں آ جائے گا اِس پریت کے
باگھ کے سر سانپ کے دھڑ والا یہ عِفریت
کھوب دے گا دانت گردن میں تری
دیکھیو مت کھولیو
مت کھولیو اِس وِش بھرے موذی کا منہ
اژدر کا منہ،
اجگر کا منہ،
افعی کا منہ،
اِس وِش بھرے موذی کا منہ
یہ رگیں،
(دور تک پھیلی ہوئی،
برزخ تلک پھیلی ہوئی جڑ)
گڑ نہ جائیں تجھ میں بھی
یہ سرخ سانپ اِس کینہ ور کی دُم ہیں
کھا سکتی ہیں سب دنیا کا سبز
دیکھیو یہ بھوت آدم خور ہے
سانس لیتا ہر مَنُش کھا جائے گا
مت کھولیو

مت کھولیو اِس وِش بھرے موذی کا منہ
اِس خبیث آزار دہ کو مرنے دے
اِس جھڑوس ایذا رساں کو مرنے دے
اِس کے مر جانے میں انساں کا بھلا
اِس کے مر جانے میں یزداں کا بھلا'

خواب

زُلف کے نرغے میں خواب
خواب فسونِ سراب
اُس کی جبیں پر کھدی، اُس کی جوانی کی شام
بوسۂ لب، خامشی، خواب تذبذب کا جام
دن کی درخشندگی میں آدمی سارے نبود
رات کے اندھیر میں مژدۂ راہِ ثبات
باغِ عدن سے تہی، خوابِ نویدِ بہشت
خواب اک ایسی کُنشت،
جس میں خداؤں کو موت
اور بشر کی حیات

جسم ادھ ڈھکا ہوا

جسم ادھ ڈھکا ہوا

جام ادھ پیا ہوا

خواب و خُم کھلے ہوئے

نظم ادھ لکھی ہوئی

وقت کے مدار میں ، منجمد ہزار پل

تیوری چڑھی ہوئی

چیخ اک رُکی ہوئی

اشک اک تھما ہوا

آنکھ رت جگی ہوئی

وقت کے مدار میں ، منجمد ہزار پل

برف کچھ جمی ہوئی
جان پر بنی ہوئی
مخمصہ، مغالطہ
چُپ ہے ٹک لگی ہوئی
وقت کے مدار میں، منجمد ہزار پل

دجال

چھپکلی چیختی ہے رفت کی بے خوابی سے
ٹڈیاں کاٹتی ہیں رات کے گونگے پن کو
سرد صرصر کی زباں رونگٹوں کو چاٹتی ہے
خاک کے سیم زدہ تودے پہ سوسن اُگ آئیں
ایسے اُگ آئی ہیں مجھ راکھ پہ جلتی سانسیں
میں کہ ہوں، ہوں بھی نہیں، پھر بھی جیے جاتا ہوں
وہ کہ ہے، ہے تو سہی، پھر بھی کہاں ہے آخر
غم کے رخنوں کو بھرے جاتا ہے تھکتا ہی نہیں
مرگ کا سنکھ بجے جاتا ہے رُکتا ہی نہیں
سر پہ یہ نیل کا دریا ہے یا کانا دجال
چاند کی آنکھ سے تکتا ہے مئے ازرق کو
رنگ تاروں کے غٹکتا ہے

’اے کانے دجال
کیوں نگل جاتا ہے سیال سمے زورق کو؟
دل کی بے جان زمینوں سے نکالو دجال
احمریں ہاتھ،
مرمریں جسم، ابابیلوں کا خون
مُردہ چڑیوں کے زنخداں
تانبے کی چیخیں
گرتے ہاتھی کی فُغاں
کتنے آزردہ ہیں قریوں کی تباہی کے نشاں
اشک دریاؤں کو فرمان سنا دو اب کے
سب کے سب بار دفینوں کے بہا لے جائیں
جن کو غاروں کے حزیں کشف نے تصویر کیا
وقت کی سوئی کی تکرار نے تعمیر کیا‘

نیتیں

کہاں کی نیت کی بات کرتے ہو؟
پاکبازوں کی نیتوں کی ؟
مرے سرہانے تو اِس طرح کی کسی بھی نیت کے بُت نہیں ہیں!
مرے سرہانے تو جسم کی بھوک دیوتا بن کھڑی ہوئی ہے
بتاؤ اُس دیوتا کا بُت بھی گرا ہے جس کا خمیر ماؤں کی نال میں ہو؟
یہ طبعِ شہوت کا لوبھ ہے جو،
تمام چوہوں کی دُم کُڑکّیوں میں پھنسی ہوئی ہے

اٹا اندھیرا، پسینہ، بد بو
خُمار، جام و سُبو سبھی ہیں
گداز جسموں پہ کاو کاو آتشی ہوس کے نشاں تو ہیں،
نیتیں نہیں ہیں،
یہ پاکبازوں کی تھوتھی، بے رنگ نیتیں
بتاؤ اُس دیوتا کا بُت بھی گرا ہے جس کا خمیر ماؤں کی نال میں ہو؟

بلڈ پریشر

آہ جکڑے ہے رگِ جاں کو،
یا کیڑوں کا ہجوم،
ریشہ ریشہ بُنے ریشم کے رسن طوق کیے
پھر سے دُزدانِ ابد، بحرِ فنا کے قزاق،
میری راتوں میں تلاطُم کے پیالے تھامے
ہا و ہو کرتے ہوئے چیختے گھڑ لیتے ہیں،
سچ کی آغوش میں پلتی ہوئی دنیا کے قصص
سچ کی آغوش کے چھتے میں زمانوں کے مگس
عَسَلِ یادِ گُل اندام لُنڈھا آتے ہیں
سچ کی آغوش کے بے پایاں خلا میں ہر رات
ہفت اورنگ بُھلسنے کا سبب پوچھتے ہیں
کسی انجان مصور کا کُھرا ڈھونڈتے ہیں

بامِ فردوس سے کودیں گے حشیشین ابھی
منہ میں دابے ہوئے طوماروں پہ پیغامِ خدا
برہنہ حرف معانی کے لبادے اوڑھے
اک گِراں ڈیل سے سائے کی طرح رقصاں ہیں
عقل کی آگ کے ، الحاد کے گِرد
اک پری زاد کے گِرد

میل

دو ندیوں کے میل سے پہلے
دو رنگوں کے میل سے پہلے
دو سوچوں کا میل ہوا تھا
یہ بھی تو ہو سکتا تھا
دونوں اک دوجے میں ضم ہونے سے منکر ہوتے
رُک جاتے دریاؤں کے دل
رنگوں کی کوکھ سے بچہ گرتا
سوچیں اپنے بال بکھیرے
دور اماوس رات میں تکتیں
نادیدہ مہتاب کا رستہ

کیسا جینا

سانس روک کر
ہردے کی ڈوبتی دھڑکن گننا
کیسا جینا ؟
نیلی رگوں پر
اُنگلی رکھنا چیخیں سُننا
کیسا جینا؟
گلی گلی کی قبریں گھننا
مردہ لاشے اکثر چُننا
کیسا جینا ؟

ہردے: دل

اندھی آنکھوں سے رنگ جَننا

گونگی جیبھ سے شعر اُگلنا

کیسا جینا ؟

بھیتر بھور بھئے تاروں کی

ارتھی اور اگنی کا جلنا

جینا وینا؟ ـــــ

کیسا جینا ؟

ریل کہاں رُکتی ہے

ریل کہاں رُکتی ہے
شیشے کے اُس پار سے تیرے کھلتے لب
آنکھوں میں دفناتا ہوں
تا کہ رات اُنھیں رو پاؤں
دروازوں کا بند ہو جانا
ریل کے چلنے کا اعلان
دو ہاتھوں میں اک شیشے اور کچھ صدیوں کی دوری
چھک چھک۔۔۔ چھک چھک۔۔۔ چھک چھک۔۔۔ چھک چھک

دھندلاتے پیڑوں میں گزرے پل گُھل جاتے ہیں
گھاس پہ لیٹے ہم دونوں
تیری کمر پر میرا سر،
۔۔۔غم کا بار۔۔۔
کوئی سوکھی گھاس کے گٹھر میرے سینے پر رکھ دیتا ہے
اک چڑیا بھی ریل کے آگے اُڑتے اُڑتے تھک جاتی ہے
ایک چھناکے سے رَت ہو جاتا ہے شیشہ
پر ریل ۔۔۔
ریل کہاں رُکتی ہے

ایک ہی مصرع

دیواریں اور کائی

دونوں بڑھ جاتے ہیں نظموں میں

تم کیوں دل چھوٹا کرتی ہو؟

شعروں میں یہ غم وم لکھنا ۔۔۔

اچھا چھوڑو ۔۔۔

رونا دھونا کیوں سنتی ہو ؟

جتنی بھی لمبی ہو جائے

چھایا ۔۔۔ آخر ہے چھایا ہی

تم کیوں دل چھوٹا کرتی ہو؟

کل اک چڑیا نظم میں مار کے

خون اُس کا امبر پر پھینکا
اُس کو زندہ کر دیتے ہیں
امبر کا رومال بنا کر
کوٹ کی جیب میں رکھ لیتے ہیں
غم کے بادل سے اک ٹپکا
سیپ کے لب پر دھر دیتے ہیں
تم کیوں دل چھوٹا کرتی ہو؟
جس ڈھانچے کو چاب رہے تھے
اس ڈھانچے پر ماس لگا کر
ایک سڈول بدن کا خاکہ گھڑ لیتے ہیں
یا اون وون سے بُن لیتے ہیں اک لڑکا
اک اک مصرع اُس کے دو ہاتھوں میں رکھ دیتے ہیں
اک مصرع سے عطر کی خوشبو
دوجے میں اک پھول کا لمس
تم پر ہے تم کیا چاہتی ہو
ان دونوں میں ایک ہی مصرع سچ ہے
ایک ہی مصرع

فون کی گھنٹی

فون کی گھنٹی جیسی ہو تم
رات کا تیجا پہر ہوتے ہی بجنے لگ جاتی ہو دل میں
گھنٹی کی تکرار سے جگ جاتا ہوں میں
اپنے پلنگ سے اُٹھتا ہوں
چونگا اٹھا کر ہیلو ہیلو کہتا ہوں لیکن
کوئی جواب نہیں دیتا

مار پیچ

جسم سے اپنے مُبَرّا ہو گیا تھا رات میں
عقلِ کُل سمجھا تھا ذَرّہ ہو گیا تھا رات میں
ایک ذَرّے کو عدم تک پہنچتے صدیوں کا غم
ایک ذَرّے کا ہزاروں مار پیچوں سے گُذر
یاں فنا ہوکر فنا ہونا کہاں ممکن ہوا

یورینیم کے خواب

سالِ یورینیم کی کیا کہوں، سات بونوں کی حکومت کو ختم ہونا ہی تھا مگر اِس دنیائے فانی پر رذیل مینڈک کی حکومت کا ہونا کسی کابوس سے کم نہیں ۔ اب وہ مالک ہے اور ہم گزیدگانِ روز و شب جو پہلے بھی محکوم تھے اب بھی غلام ہیں ۔

رذیل مینڈک ٹی وی پر اپنی حکومت کا اعلان کرنے کو ہے (ہنستے ہوئے) :

'وہ سات بونے کہاں گئے جو ہماری پلکوں کو نوچتے تھے؟
جو صبحوں شاموں کے چرخ تھامے ہماری سانسوں کو کاتتے تھے؟'

داستان گو ایٹم بم پھٹنے کا منظر بیان کرتا ہے جس کے بعد انسانوں کی حکومت کا اختتام اور رذیل مینڈک کی حکومت کا اعلان ہوا :

'نہاں تھیئٹر میں رقص گرداں جو پُتلیاں تھیں وہ رُک گئی تھیں

خدائے پنہاں کا ہاتھ تھامے جو رسیاں تھیں وہ کٹ گئی تھیں
عدم کی لوحِ یقیں پہ لکھے حروف معنی تلاشتے تھے
جلے پروں سے فرشتے اپنے خدائے فانی تراشتے تھے
کچھار خلیے کی چھوڑ دھواں
یورینیم کے نحیف پلّوں کی زرد چمڑی کو چاٹتا تھا
سلگتی لاشوں کی بوئے بد کا خمیر نتھنوں کو کاٹتا تھا
قرون لمحوں میں مُنفجر تھے
سُکڑتی چمڑی کو بوٹی بوٹی سے گرم ناخن کھروچتے تھے
جنین ماؤں کے نوکِ پستاں ، چبا رہے تھے، دبوچتے تھے
جگر سے رِستا لعاب چیخوں کے ہاتھ گرتا
نزع میں بکھرے دلوں کی آشائیں کسمساتیں
بدھا کے لاشے پہ بین کرتا، درخت پیپل کا سڑ گیا تھا
وہیں پہ سندھو ندی کا اژدر زمیں کی گردن پہ چڑھ گیا تھا
رذیل انساں کا ہجو گاتا
رذیل کیچڑ کا سبز مینڈک، تمام فانی جہاں کا مالک
کبھی پھپولوں پہ رقص کرتا، کبھی ببولوں پہ گنگناتا'

رذیل مینڈک کو پھر ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے (ہنستے ہوئے) :

'وہ سات بونے کہاں گئے جو ہماری پلکوں کو نوچتے تھے؟
جو صبحوں شاموں کے چرخ تھامے ہماری سانسوں کو کاتتے تھے؟
کہاں ہیں امید کے پیمبر
کہ گر وہ آئیں

تو ہم ذبیحوں کے خون اندر
نہائیں اور پھر ابد کو جائیں ۔۔۔
ابد کو جائیں؟'
رذیل مینڈک کے قہقہے گونج اُٹھے تھے آسماں میں
'خدا کہاں ہے؟
ابد کہاں ہے؟
خدا ہمیں ہیں!
ابد یہیں ہے!'

ذہن کا جنگل

لوگوں کے ناموں کے انڈے پی جاتا ہے وقت کا سانپ
فون کے نمبر فکر گلہری کھا لیتی ہے
سودے کی فہرست الم کے گارے میں اوندھی گر جاتی ہے
دفتر میں کیا کیا کرنا تھا بھول گیا ہوں
یا شاید اک ہرن کا بچہ میری توجہ کھا بیٹھا ہے
ایک شکاری حافظۂ کوتہ مدت کے اُڑتے پنچھی مار رہا ہے
ٹھا ٹھا۔۔۔ ٹھا ٹھا۔۔۔ ٹھا ٹھا۔۔۔ ٹھا
پھر تیری یاد کا باگھ اچانک دھاڑتا ہے
ذہن کے نیلے جنگل میں اب
کوئی شکاری، کوئی گلہری، سانپ، ہرن یا ہرن کا بچہ کوئی نہیں ہے
بس گارے میں باگھ کھڑا ہے
کیوں ڈر جاتے ہیں سب تم سے؟

حافظۂ کوتاہ مدت یا حافظۂ کوتہ مدت: شارٹ ٹرم میموری

اِیڈیٹ باکس

تمام لیکھک سیاہی پی لیں
ہوا میں تھوکیں پلید اکشر
زبانیں کالی نہیں تو کر لو
بکوتو بچھو کا ڈنک جھاڑو
رُکوتو غَرّاے ایدھر اودھر
تِروتو کچھوؤں کے خول پھاڑو

سیاہ دلدل ہے کھینچ لے گا
سمو چا رنگت کو اپنے بھیتر
اِکہری سانسوں کو مینچ لے گا
سجیل شیشہ ہے اینچ لے گا
نگہ کے تانے،
مچاؤ ہلڑ
گھر اپنے بالیں گے خود یہ پھوہڑ
سجیل شیشے کو تکنے والے
بھدیس، انگھڑ، چھنال، لچر
انہیں ہیں شورش کے راگ ازبر
سو تم بھی منہ میں سیاہی بھر لو
ہوا میں تھوکو پلید اکثر

فکریں

پلکیں خون سے جم رہتی ہیں، آنکھیں رو رو تھم رہتی ہیں
تیری زُلف کے مار پیچ میں، گھڑیاں سَم درسَم رہتی ہیں
جو زُلفیں سنوری رہتی تھیں، اب درہم برہم رہتی ہیں
راتیں بستر پر نہیں سوتیں، برف کی سِل پر جم رہتی ہیں
چڑیاں دھڑکن کی ساون میں، دل کے پیڑ پہ کم رہتی ہیں
ہستی کے غم کو روتی آنکھیں، کیوں جو یائے عدم رہتی ہیں؟
میرا کلیجہ کھا جاویں گی، فکریں جو ہر دم رہتی ہیں

تم آئے؟

کیوں مژگاں کا مسکارا ہے سورج کے دل کی کالک
رنگِ اُفُق گالوں کا غازہ ۔۔۔۔۔تم آئے
جھاڑتے جھاڑتے تاروں کی وحشت کا غبار اُکتایا چاند
کھینچ چکا شب کا خمیازہ ۔۔۔۔۔تم آئے
تیرے بعد زمانوں سے میں قید ہوں اِن بند آنکھوں میں
کھول دیا کس نے دروازہ ۔۔۔۔۔تم آئے
عُریاں کمر کو ہونٹوں نے جو لمس کیا تھا شعر ہوئے
بندِ خیال میں اَچرج تازہ ۔۔۔۔۔تم آئے

دل کے پیڑ پہ کب سے بیٹھیں تھیں کچھ چڑیاں دھڑکن کی
بھاگیں ہوتے ہی اندازہ ۔۔۔۔۔تم آئے
شام کے فرش پہ بکھرے پڑے تھے دل کے بوسیدہ اوراق
کا ہے باندھنے کو شیرازہ ۔۔۔۔۔تم آئے

شاہ زادی اب نہیں ہے

(عاصمہ جہانگیر صاحبہ کے نام)

شہسوارو!
وقت کے گھوڑوں سے اترو!
شاہ زادی ،
جس کے تیغے کی چمک سے ڈر کے طاغوتوں کے ہاتھی
اپنی فوجوں کو کُچل دیتے تھے،
وہ جنگجو سپاہی خاک ہوتی ہے
نِگوں سر، پرعلم ، اونچے اٹھاؤ
دل کی دھڑکن کو طَرَب کی تھاپ سمجھو
اور رَجَز گاؤ
خمیدہ حوصلوں کی لاش پر پڑھ کر اُنھیں پھونکو

ابھی جرأت کے بھالوں نے
نجانے کتنی زرہوں سے گزرنا ہے
اگر پیتل کی ڈھالوں کی نِڈر آنکھوں کو پگھلانے کا یارا
شاہ زادی ہی کے بس میں تھا
تو سن لو شاہ زادی اب نہیں ہے
اب تمہاری سبھی تلواروں کو لڑنا ہے
المنا کی؟
قسم مولا کی !
درد اِتنا ہے آہن کو نگل جائے
ذبیحوں کا لہو پی لے
قسم مولا کی !
درد اِتنا ہے راتیں نیند کی دیواریں چاٹیں گی
مرا ڈھانچہ چبائیں گی
قسم مولا کی !
درد اِتنا ہے میری روح کا خیمہ اُکھڑتا ہے
مگر نیزوں کو نیچے کرنا تلواروں کو رکھ دینا گناہ ہے
شاہ زادی کی شُجاعت کے علم اونچے کرو !!
گر شاہ زادی اب نہیں ہے اُس کی شمشیروں نے جینا ہے
گلوں کو پھاڑ کر چیخو!!
ابھی گھمسان کا رن ہے

رات کے دانت

رات کے دانت گو نہیں ہوتے
رات سانسوں کو چاب جاتی ہے
کرب کے بے زمین مُردوں کو
رات خوابوں سے کھود لاتی ہیں

کابوس

مری آنکھ یک دم کھلی،

دیکھتا ہوں

کھلی کھڑکیاں تھیں

تیز رفتار گِدھ،

آہنی غول آسا پرندوں کا جُھنڈ،

پَر فِشاں تھا

گِھر ہر طرف تھا

گرجتا ہوا آسماں ہی خدا تھا
ہر اک ثانیہ یوں تھا جیسے
کوئی دو گِراں ڈیل ہاتھوں سے
مری دھڑکنوں کا دُہُل پیٹتا جا رہا ہو
گھڑی کی وہ ٹِک ٹِک قیامت ہی کا ہمہمہ تھی
(وہ محشر کا قرنا)
(وہ خوابوں کی قبروں کا کُھلنا)
(وہ مُردوں کا جگنا)
وہ یوم البعث کا ساعت کترتا ہوا زمزمہ تھی
وہ گھڑی
کسی اونچے لمبے ہیولے کا سایہ تھی
ہیولے کے آگے کو بڑھتے قدم،

دم بہ دم
انتزاعِ تن و جاں تھے
وہ بیکراں دلدلوں پر برستا ہوا آسماں تھے
گِراں ڈیل مجھ کو جگاتا تھا، جاگو!
(وہ سرگوشی کرتے ہوئے، نیم وا سی نظر مجھ پہ ڈالے، یہ کہنے لگی: 'بھیڑیں گِن لو')
پر اُس ایک لحظے میں بھیڑیں کہاں تھیں
سر کٹے بھیڑیے، اپنے نوکیلے دانت
اور کالے مسوڑے نکالے
ہنسے جا رہے تھے

ہنسے جا رہے ہیں!

کوئی کھڑکیاں بند کر دے

کوئی بیٹری اِس گھڑی کی نکالے

کوئی مجھ سے کہہ دے میں زندہ ہوں اور

یہ فقط خواب ہے، ایک کابوس ہے

مرے حس کے پنجے،

تنوں میں کھبے

شجرِ اوہام پر

چند لنگوروں کی مانند اوپر کو چڑھتے چلے جا رہے تھے

کوئی میرے برزخ کے اِس گہرے کنویں میں اب ڈول ڈالو

کوئی؟

کوئی ہے؟

سنو؟

کوئی ہے؟

میں زندہ ہوں مجھ کو نکالو!!

کوئی عزرئیل و سرافیل سے جا کہو

مری روح کو قبض کر لو

یا پھر صور پھونکو،

میں زندہ نہیں، پر مرا بھی نہیں ہوں

میں اِس دارِ پندار پر،

اپنی چند آخری ہچکیاں لے رہا ہوں

ہارٹ اٹیک

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

کیوں دھڑکنوں کے کرب سے گونجے ہیں ترے کوچہ و بازار ؟

ہر سانس ہے اندھیار

غم کے اَحدی کیوں ہیں یہاں مشعلہ بردار ؟

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

یہ یاد کے قاصد ہیں جو اِس آنکھ کے قلعہ کو چلے آئے ہیں ؟

یا کھردرے گالوں اُبھر آئی ہیں ہونٹوں کی عبارات ؟

یہ چاپ ہے قاصد کی یا اشکوں کی مُناجات؟

اِس دھنستے ہوئے قلعہ میں کُھلتی ہے

ہر اک لمس

ہر اک ہوس کی طومار

اک لمحۂ سرمستی و وجدان کی تکرار

کیوں تجھ کو اور اِس لمحے کو گھیرے ہے گئے وقت کے سیمان کی دیوار

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

اُڑتے ہیں کیوں آکاش پہ دھڑکن کے ابابیل

دھڑکن کے ابابیلوں کی مِنقاروں میں دابا دلِ صد لخت

اِس سختی کی چلکار میں یہ رات

یہ رات ہے خونبار

کیوں ہے ہمیں چنگھاڑتے ہر فیل کا انکار

مِنقار سے گرتے ہوئے ہر لخت کا اقرار

اے عالمِ پندار،

اے بختِ نگوں سار

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

اے شہر جہاں قبروں کے کھُلنے پہ ہے اصرار

اے شہر جہاں مُردگاں خوابوں کے ہیں کردار

اے شہر جہاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں چڑیلیں

نبضوں کی جھپکتی ہوئی دو آنکھوں کے آثار

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

سیمان: سیمنٹ

سورج کے سواروں کا گذر ہو گا کبھی یاں ؟

ظلمت کی خموشی سے سراسیمہ

اِس گھاٹی میں،

اُتریں گے سروشاں؟

اے شہرِ خموشاں؟

اے شہرِ دلِ زار؟

کچھ بول

اے شہرِ دلِ زار؟

کچھ بول

کچھ بول

مرتا ہے یہ بیمار

اے شہرِ دلِ زار

اے شہرِ دلِ زار

فصلِ گل آنے کو ہے

فصلِ گل آنے کو ہے
ایک جھینگر کی گئے موسم میں تیرے
ادھ کھلے جُوڑے تلک کی جَست
پھر سے جھائیں جھائیں کر رہی ہے
وہ ۔۔۔
ہڑبڑاہٹ میں ترے جوڑے کا کھلنا
وہ۔۔۔
ترا سہمے ہوئے زوروں کا ہنسنا ،
میرے پائیں باغ میں،
خالی پڑی کرسی پہ پھر سے کِھل اُٹھا ہے

ہم ---

پھر کھڑے ہوں گے تمھارے بِن ادھورے

گھاس پر لیٹی گلہری کی کترتی چیخ میں،

پنچھیوں کی پھڑ پھڑاہٹ میں،

گلُوں کی چُپّی میں،

ناشپاتی کے اکیلے پیڑ کے دامن سے گرتی کِرم خوردہ آرزوؤں میں،

سورج مکھی کی نال سے باندھے گئے سورج کی ڈھلتی نبض میں،

دھم سے گرتے آسماں کی بے بسی میں ،

ہم ---

پھر کھڑے ہوں گے---

تمھارے بِن ---

ادھورے

فصلِ گُل کی راہ تکتے،

زخمِ دل کی بھینی خوشبو کے ازل سے منتظرِ

کیسے

میں نے جگر کی کلونچ سے کیسے دنیا رنگی
میں نے کیسے دو آنکھوں کے اندھے پن کو دھنک بنایا
کیسے ساگر کے پیاسے ہونٹوں پر
میں نے نمکیں خوابوں کا سیال لُنڈھایا
کیسے۔۔۔
ایک گلہری سردی میں
میری محبوبہ بن بیٹھی
کیسے میں نے
اس کے ٹھٹھرتے ہاتھوں میں اخروٹ تھمائے
اور نظمیں لکھیں
کیسے میرے بدن سرائے میں،

سورج نے

رین بسیرا کرتے

میرے کان میں دن کا غم کہہ ڈالا

مجھ میں

پیت کے نغمے گاتے

ایک پپیہے نے چپ سادھی

کیسے میں نے اماوس کے اندھیر نگر میں

چاندنی کی کوچی پکڑی

اور اک چاند نیا گھڑ کر آکاش پہ رکھا

کیسے میں نے اپنا بدن اک جنگلی کبوتر کو چگوایا

اور اُڑنا سیکھا

کیسے میں نے دیواروں کے کانوں سے الفاظ چُرائے

کیسے غزل کے معانی

تنہائی کے بن میں زخمی ہرن سے سیکھے

تیری خوشبو کی راہ تکتے

میں نے کیا کیا وہم پکائے

کیا بتلاؤں

کاش

کاش ہم تم ملے نہیں ہوتے
اور مل کر ہنسے نہیں ہوتے

کاش ہم آنسوؤں کی ندی میں
شام ہوتے ڈھلے نہیں ہوتے

کاش ہم غار کے دہانے سے
روشنی میں گئے نہیں ہوتے

کاش رنگوں کی داستاں سن کر
ہم دھنک پر چلے نہیں ہوتے

کاش شبنم سے سیکھ کر گریہ
چاندنی میں بہے نہیں ہوتے

کاش ہم آسمان کے تارے
پارہ پارہ ہوئے نہیں ہوتے

عصرِ بخارِ آب

عصرِ یخبندان کے ختم ہونے پر عصرِ بحر آیا، پر صدیوں پر محیط اس دور کو بھی ختم ہونا ہی تھا۔ مارِ دریائی نے جب عصرِ بخارِ آب کی پیش گوئی کی، تو آب کے سب باسی دم بخود رہ گئے۔ اُنھیں یقین ہی نہ ہوا کہ وہ اور یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر ایک ذَرّے کے پھٹنے سے فنا ہو جائیں گے، جسے چند غول آسا و بزرگ ہیکل پرندے اپنی چونچوں میں دبائے لا رہے ہیں۔

'عصرِ بخارِ آب کیا ہے؟' کسی نے پوچھا
تو مارِ دریائی نے تہدیدی لہجے میں کہا
'وہ پھڑپھڑاتی ہوئی بھاپ ہے!'

عصرِ یخبندان : آئیس ایج، بخارِ آب: بھاپ، مارِ دریائی: سمندری سانپ

جو گھڑی آنے کو تھی سو وہ گھڑی آ ہی گئی ہے
وہ گھڑی جو کائی نے کہنہ ستونوں پہ لکھی تھی
بحر کے کہنہ ستونوں پر

یہ ــــ
وہ گھڑی ہے
وہ گھڑی ہے
تمھیں تِرنے کی پڑی ہے !
سنو غور سے
یہ جو شور ہے
یہ بخارِ آب کا دور ہے
جہاں ہر یقین
ہر اک علم و دیں
کا حباب ہی کا سا طور ہے
جو گھڑی آنے کو تھی سو وہ گھڑی آ ہی گئی ہے
آب کے سب باسیوں سے کہہ دو جا کر آج ہی
آہنی غول آسا پکشی چونچ میں آتش لئے آنے کو ہیں
یہ بخارِ آب کے اُس دور کا آغاز ہے
جس کے قصے ہم نہنگِ عنبر و تمساح سے سنتے رہے
سن رہے ہو؟
ایک ذرّے کو سنایا جا رہا ہے بیضۂ عنقا کا رمز

نہنگِ عنبر: sperm whale، تمساح: مگر مچھ، بیضۂ عنقا: عنقا نامی ایک افسانوی پرندے کا انڈا

بھاپ کے پر پھڑ پھڑاتے ہیں نہفتہ کرب سے
اب صماخِ دہر کے پردے یکا یک پھٹ رہیں گے
دھک سے رہ جائیں گے دل دریاؤں کے
دھم سے ساگر پر گرے گا آسماں
دھم دھڑک دھم دھم
دھم دھڑک دھم دھم
دھم دھڑک دھم دھم
سن رہے ہو غور سے شورِ نُشور؟
وقت کی زنبیل میں ٹھونسی مصیبت کا ظہور،
سن رہے ہو؟
روشنی کے گھڑ سواروں کا سیاہ گڑھوں میں گرنا،
اور وحشت سے خلا کی،
غم زدہ تاروں کا گرنا،
سن رہے ہو؟
عصرِ یخبندان گذرا اور عصرِ بحر آیا
اب بخار آب کے ۔۔۔
دور کا آغاز ہے
بھاپ بن کر اُڑ رہیں گے سب کے سب پانی کے بت
جن کے آگے تم نے جبہہ سائی کی
گڑگڑائے

صماخ : کان کا سوراخ

مچھلیو !

کچھوو !

حذر اے ہشت پاؤ !

تم تمہارے سب خدا مٹنے کو ہیں

جو گھڑی آنے کو تھی سو وہ گھڑی آ ہی گئی ہے

کچھوو سن لو!

اپنے خولوں کے کڑے پن پر اکڑنا چھوڑ دو

یاں تمہارے خولوں کے مینار در مینار ہوں گے

جن کو پِگلا کر بنائے جائیں گے سیال برج

مچھلیو نازاں ہو تم سرعت پہ اپنی ؟

سست رو لمحے یہاں پر حلقۂ صد کام ہیں

دام کی صورت دبوچیں گے تمھیں

ہشت پاؤ !

اے زُلال اندام روحو !

رنگ کے اُجلے سفیرو !

اندھے لحظوں کی فصیلیں تنگ ہوتی جا رہی ہیں

کوکھ میں گیتی کے جیو اک اور جیوت ہو رہا ہے

اور تم اب صرف اک مردہ جنیں ہو

تم کو اس جراح کے نشتر کی تُندی کی قَسم

لامکاں اک گرم تانبے کا پیالہ

ہشت پا: Octopus

اور تم پیالے میں ہو

ٹکڑا ٹکڑا

لخت لخت

دیکھو یاں

ہاں یاں پہ مجھ کو دِکھ رہا ہے ۔۔۔

آب کے قطروں کو روتا ریگزار

ریگ کے دل کے توہم سے اُبھرتا ایک بے پایاں سراب

جس کے ذَرّوں میں تمھاری ہڈیاں، دل گل رہے ہیں

گل بھی چکے ہیں

سنتے ہو؟

تم فنا ہو بھی چکے ہو

جو گھڑی آنے کو تھی سو وہ گھڑی آ بھی چکی ہے

نثری نظمیں

زُلال دیواریں

سمندر خالی ہو گئے؟
اور زمینیں بنجر؟
سورج کی کرنیں چمکنا بھول بیٹھیں ہیں
اور چڑیاں ہنسنا؟
میری یاد داشت کے کمرے میں
میرے ساتھ فقط ایک نیل کنٹھ ہے
اور کھڑکی سے باغ دِکھتا ہے
ہم اِس جیل کی زُلال دیواروں کو ٹکریں مارتے مارتے
تھک گئے ہیں
ہم فقط تمہارے چہرے کو دیکھ کر وقت بتا سکتے تھے
تم کہاں چلی گئیں؟
کیا رات ہوگئی ہے؟
یا ہم اندھے ہو گئے ہیں؟

اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی

اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو تم عام سی لڑکی نہیں رہو گی
میری سطریں سمندروں میں کود کر
تمہارے ناف پیالے کے لئے
زمرد کے ٹھنڈے پتھر اکھٹے کریں گی
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو شہد کی مکھیاں
تمھارے پِستان چومنے کی لو میں
گلابوں کے لوبھ سے آزاد ہو جائیں گی
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو تمھارے چہرے کی روشنی سے

عدم کے تاریک قریوں میں
رنگین کمانوں سے
خوابوں کے بان چلائے جائیں گے
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو پیڑوں کی اُنگلیاں
تمہاری آمد کی خوشی میں
ہوا کی تاروں سے سُر نکالتے
خود کو زخمی کر لیں گی
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو تمہاری کمر کے تیغے پر
لب اپنا آپ رکھ کر
خون کی پھواروں میں زندگی تلاش کریں گے
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو تمہارے کولہے کا تِل
تمثیل کی کان بن جائے گا
غم جس کی یاد میں
نئے استعارے کھودنے وہاں آیا کرے گا
اگر مجھے تم سے محبت ہو گئی
تو تمھارے کاکل کے مُردہ سانپ
جنگ میں لڑتے
مجھ مردہ سپاہی کی جیب سے ملیں گے

بودا درخت

یہ کون کُھنڈی آری سے میرا تنا کاٹ رہا ہے
کون میری وَکھیوں کی ٹہنیاں توڑ رہا ہے
مجھ سے نیانڑوں کے جھولے بنانا
یا سکول کی نِکی نِکی کرسیاں
میرے ہاتھوں سے سالنوں کے ڈونگے چمچ
میرے پیٹ سے سہاگ رات کے رنگلے پلنگ
چل بھانوے، مجھے انگیٹھی میں ڈال دئیں
میری آنکھیں بس رہن دے
میں نے اپنی ماں کا رستہ تکنا ہے
میں ایک بودا درخت ہوں

کُھنڈی: کُند، بھانویں: چاہے، وکھی: پسلی، نیانڑا: بچہ، نکی: چھوٹی، رنگلا: رنگین

جسے سبزا دیکھے اسی سال ہو گئے ہیں
مائے وے مائے
تیرے کہن پر
میں اپنی انتڑیاں پھیلائے
پانی ڈھونڈتے، ہزاروں فٹ نیچے آ گیا ہوں
مائے وے مائے
یہ کدھر جنا تو نے مجھے؟
جدھر اَنےّ دریا، پتھر ٹٹولتے رستہ بھول جائیں
کوّے بھوک سے اپنے موئے ساتھیوں کے
ڈھانچوں کا سُکھا گوشت چاٹتے ہوں
کوئل موت کی تسبیح پڑھتی ہے مائے
مائے وے مائے
یہ کدھر جنا تو نے مجھے؟
جدھر سانپ زہر کی دوات میں اپنی زبان ڈوب کے شعر کہتے ہوں
جدھر مچھیوں کے آنسوؤں کا کھارا پانی یاد کرتے کشتیاں بودی ہو گئی ہوں
مائے میں ان کشتیوں سے بھی زیادہ بودا ہوں
ریت کے جھکڑ میں جو تیری تصویر بنتی ہے
اس سے ہر روز کہتا ہوں
میں اِس سال کے سوکھے میں
اور نیچے نی کھود سکتا
اسّی ورے ہو گئے یہ کہتے کہتے

ورے: سال

میں اب اور نی کھود سکتا مائے

مجھے اپنے خشک ہونٹوں میں داب لے

میرے ٹھنڈے پیر اپنے گرم پیٹ سے لگا لے

مجھے اپنے بوڑھے سینے میں بھر لے

میں تھک گیا ہوں مائے

قسمے

میں بہت تھک گیا ہوں

کشمیری شال

وہ جو دور کھڑکی پہ لٹک رہی ہے دھوپ سے بچنے کو
کسی نے بہت چاؤ سے کشمیر کی تنگ گلیوں سے
خریدی ہو گی
جانے آرزؤں کے کتنے چکور
انجان پہاڑوں سے اُڑ کر
اُس وادی میں آن بیٹھے ہوں گے
جہاں ایک نو بیاہتا بیوہ اپنے شہید شوہر کی یاد میں
لال پھول کاڑھتے کاڑھتے بوڑھی ہو گئی تھی
وہ چکور دیواروں پر کبھی نہیں بیٹھتے
کیونکہ کشمیر کی دیواریں خار دار تاروں
اور کانچ کے ٹکڑوں سے گوندھی گئی ہیں

'لے کے رہیں گے آزادی' چیختے چیختے اب وہ کبڑی ہو گئی ہیں
جیسے کھڈیوں کی لے کو شال کے دھاگے پہچانتے ہیں
پیچھا کرتی جیپ کی چنگھاڑ کو
بندوق کی گرم نالی سے نکلتی دھاڑ کو
اُس آواز سے گونجتے پہاڑ کو بھی
شال کے دھاگے جانتے ہیں
اور اُس آہ و بُکا سے دور
جہلم کی مٹیالی سرگوشیوں سے پرے
اِس شال کا تحفہ دیتے ہوئے اُس نے سوچا ہو گا
کہ شاید یوں یہ شال آزاد ہو جائے
اِس کے ریشے، جاڑے کی ٹھنڈ میں
کسی سٹریٹ لائٹ کے نیچے ایک گداز جسم کو گرمائش پہنچائیں
پر وہ تو دور کھڑکی پر لٹک رہی ہے دھوپ سے بچنے کو
جیسے نئی نویلی دلہن ہو اور پہلے ہی دن
چپ چاپ رسوئی گھر میں چولھا جھونک رہی ہو

وادیٔ ھَبھَب

وادیٔ ھَبھَب میں
فقط آکاش گنگا کا سوریا پگلایا نہیں گیا
تمھارا دل اور ہڈیاں بھی گالی گئی ہیں
تم یہاں ہر شے کا اصل پاؤ گے
جس تک پہنچنے میں تمھاری ہی بینائی حائل تھی
تمھاری بینائی صرف پتھر کو دیکھ سکتی تھی
اس کے دل میں چھپی چنگاری کو نہیں
تمھاری بینائی شیشہ تو دیکھ سکتی تھی
اس کے حافظے میں پگلنے
اور نیا روپ دھارنے کے غم کو نہیں
تم یہاں ہر شے کا اصل پاؤ گے

آکاش گنگا: ملکی وے، سوریا: سورج، ھَبھَب: حدیث کے مطابق جہنم کی ایک وادی

آؤ تمھیں جبل الجبر تک لے چلوں
دیکھو اس کا نیلا رنگ دیکھو
اس پر تنی چادر انسانی چمڑی سے بنائی گئی ہے
اور یہ گاڑھا نیلا رنگ تمھارے خون کا جم جانا ہے
یہاں پر کہا گیا ہر حرف کوڑے کی تڑخ بن جاتا ہے
یہ رہا وہ کنواں جس کے نام سے اِس وادی کا نام ہے
ھَبھَب
یہاں بیلوں سے لٹک جاؤ
نیچے پھنکارتے ناگوں
کنویں کے لب پر تمھیں گھورتے خونخوار بھیڑیوں
اور مِداد کی کلونچ کی قَسم!
تمھاری قسمت تمھارے ماتھے پر لکھ دی گئی ہے
اِنھیں ناگوں کے پیٹ میں ایک نئی دنیا تمھارا انتظار کر رہی ہے

تائید کا گھاٹا

سڑک پر لگے بے نہایت سفید حاشیوں پر چلتی چیونٹیوں کی قَسم !
جیون گھاٹا ہے
اِس دیوی کو پانچ جُون بدلنے تھے
انکار، کرودھ، سودے بازی ، دل تنگی اور تائید کے جُون
ایک سر کے کُچلے جانے پر ہی دوسرا جُون شروع ہوتا ہے
دل تنگی کے دو پہاڑوں کے درمیان تائید کا گھاٹا ہے
اور تم اُس گھاٹے میں ہو !
تائید کے جُون کے بعد کالبُد نہیں بدلتے
تم یہاں وحشت کی کھوپڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں پاؤ گی
اِسے اٹھاؤ یہ تمھاری کھوپڑی ہے

کنویں سے لٹکی لڑکی کا مرثیہ

میں کنواری ہوں
میں نے تین بچوں کو جنم دیا
اور ایک خواہش کو
میں نے تین عیسیٰ دو صلیبوں پر لٹکے ہوئے پائے
سنو میں نے مریم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا
کنویں میں آگ لگاؤ
میں اگنی پریکشا دینا چاہتی ہوں
میں نے کُتیا کے چھے پِستانوں سے دودھ پیا
اور اپنے دو پِستان ناگوں کے حوالے کر دیے
مجھ سے نکلتے زہر مُہرہ نے

سموچا سنسار کا وِش پیا
میرے ننگے بدن پر چادر کی جگہ کینچلی ڈالنے والوں نے
مجھے بِل میں رہنے کو کہا
بن واس لیا
بھکشوؤں سے نروان کی بھیک مانگی
دوبارہ جنم لینے کا شراپ دیا گیا
ہائے میں جنم جلی ۔۔۔
سنو ! یہ کنواں تب سے گونج رہا ہے
جب میں نے کنویں کی بیلوں سے لٹکتے سہمے
کترتے سفید اور کالے چوہوں سے چیخ کر کہا تھا
میں کنواری ہوں

تمہیں کیسے بتاؤں

تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں
ایک بھولی ہوئی وادی کے
گمنام شہر کا بچہ تھا
وہ دھول،
جو اُس کے پہاڑوں پر اُڑا کرتی تھی
ہر سال مون سون کے آنسوؤں میں
اپنا دامن تر کیے،
گھاس پر تھک کر بیٹھ جاتی تھی،
میرے دل پر جمی ہے
تمہیں کیسے بتاؤں کہ مجھ میں
اور چند بچوں کی گرفت سے نکلے
ٹوٹی پگڈنڈیوں کی ڈھلوانوں سے
لُڑھکتے پرانے ٹائروں میں

کوئی فرق نہیں
ہماری قسمت میں
دریاؤں کے غوغوں میں گر کر
کھو جانا بہت پہلے لکھ دیا گیا تھا
تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے شہر کی مائیں
خاکستروں کی آخری چنگاری کو
زندہ کرتے کرتے
خود راکھ میں بکھرنے لگتی تھیں
اور میں اُن ماؤں کا آخری وارث
اُس خاکستر کی آگ کو چھوڑ کر
تمہارے پہلو میں بیٹھا ہوں
تمہیں کیسے بتاؤں کہ
آج میں زندہ رہنا،
تمہارے ساتھ سب بھلا کر
رقص کرنا میرے بس میں نہیں ہے
تمہیں کیسے بتاؤں کہ
پرتگال کی اِس فادو گائن کی آہ و زاری میں
مجھے اپنی موت کا مرثیہ کیوں سنائی دیتا ہے

فادو : پرتگالی میوزک کی ایک قسم ہے جس میں غمگین موسیقی کے ساتھ اداس شاعری کو نہایت محزون آواز میں گایا جاتا ہے

وہ گھڑی

وہ گھڑی جو ٹیبل پر پڑی گھڑی سے برس ہا برس پیچھے تھی
اُس گھڑی کے کانٹوں پر کیوں جُمود طاری تھا
یاد روشنائی کی بوند کی طرح پانی میں ٹھہر گئی تھی اور
خواب پھانسی لٹک چکے تھے

یہ پہلی بار نہیں

یہ پہلی بار نہیں
کہ کسی نے محبتوں کا اُترن سمجھ کر
سیب کے مُرَبّے کی خالی بوتلیں
چمڑے کا ٹوٹا دست بند
بجھے سگریٹ
اور چیڑ کے کِھنگلے سنبھال رکھے ہوں
اِس زمین کی خاک میں نہ جانے کتنی آنکھیں دفن ہیں
جو عمیق سمندروں کے نمکین پانی سے گِھری ہوئی ہیں

چیڑ کے کِھنگلے: ہمالہ میں اُگنے والے مقامی درخت (چیڑ) کی کونز کے لئے استعمال کیا جانے والا پہاڑی کا لفظ

جانتی ہو؟

جانتی ہو، نظمیں لکھ لینے سے
دل کا غُبار نہیں دُھلتا
اِس اُبلتے کھارے پانی میں
حافظے کا جھاگ نہیں گُھلتا
پھر بھی یہ آخری قطرۂ جاں
دل کی سیپی میں سنبھالے
سورج کو ڈوبتے دیکھ رہا ہوں
شاید تمھارے جانے کا سن کر،
آج رات بھی کوئی سمندر بین کرتا
مجھ میں سمانے آ جائے

تمہارا سایہ

تمہارا سایہ ابھی بھی ٹیبل کے اُس پار
مجھے گھور رہا ہے
واپس آ جاؤ
آؤ، گیلی ریت پر لیٹ جائیں گے
آؤ، کچھوؤں کی پُشت پر سمندر کی
تہ میں موتی ڈھونڈیں گے
وہ سپِی کہاں رکھ دی تم نے
جس کی قید میں ایک آنسو نے

اِس سمندر کا سپنا دیکھا تھا
آؤ ہم پھر سے اُسے ڈھونڈتے ہیں
واپس آ جاؤ
میں نے گھر کی ساری مکڑیاں مار دی ہیں
اُن کے جالے ہٹا دیے ہیں
میں اب اُن سے طلسمی کہانیاں نہیں سنتا
نیم شب میں اُن سے باتیں نہیں کرتا
واپس آ جاؤ
ہر شام آنسوؤں کی ایک کتاب لکھنے کا سوچتا ہوں
رات کے آخری پہر تک اُسے لکھتا ہوں
پر صبح اٹھ کر دیکھتا ہوں تو اُس کے صفحوں پر
سمندری نمک کے علاوہ کچھ نہیں پاتا
میرے لفظ مٹ رہے ہیں
واپس آ جاؤ
وہ بستر جہاں ہم دونوں لُخت لیٹا کرتے تھے
میری چِتا ہے
آؤ اُسے جلتا دیکھو
کیا اِس آگ کو ہمیشہ جلنا ہے
خامیاں، خرابیاں، بخشیں، سوال
سوال در سوال
وہ سب تو ابھی تک یہیں ہیں

ناچتے ہیں
میں بھی ناچ رہا ہوں
میں بھی اک سوال ہی تو ہوں شاید
پر میرے پاس اپنا کوئی جواب نہیں ہے

اِس سال میں نے سیکھا

اِس سال میں نے سیکھا
دلوں کو توڑنا
پھر اُن دلوں کی کرچیاں
اپنے دل کی کرچیوں میں ضَم کرنا
اِس سال میں نے سیکھا
چاند کی نم آنکھ کے آبشار میں نہانا
اور اپنی آنکھوں کے سفید موتیے کو چاندنی کہنا
اِس سال میں نے سیکھا
رگوں کی سکڑتی دیواروں کو پیچھے دھکیلتے،

سفید بونوں کو نگلنا

اُنھیں اپنے لہو میں گھلتے محسوس کرنا

اور اپنی زندگی کی بیاض میں

دو اور دن لکھ لینا

اِس سال میں نے سیکھا

گرم آنسوؤں کے پیروں کے چھالوں کو گِن کر وقت بتانا

ایک سگ کی محبت بھری زبان سے اُنہیں سہلوانا

اِس سال میں نے سیکھا

رائن دریا سے باتیں کرنا

اور اپنے خون کو اُس کی شریانوں سے اُبلتے دیکھنا

اِس سال میں نے سیکھا

غیروں کو اپنے معشوقوں کے بدن سونپنا

اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا

اِس سال میں نے سیکھا

خاموش بازاروں میں تنہا، ماسک پہن کر گھومنا

اور اَن دیکھے جرثوموں کی نقب کا انتظار کرنا

اِس سال میں نے سیکھا

گٹار پر،

اپنے لکھے خوشی کے گیت سننا

اور اُسی لمحے

اپنی اُنگلیوں کی پوروں پر ایک اُداس نظم کو اُبھرتے دیکھنا

اِس سال میں نے سیکھا

کوما میں پڑے اک انجان شخص کی زندگی کی

سچی دعا کرنا

اور جھوٹی ڈھارس بندھانا

اِس سال میں نے سیکھا

ایک مجازی بَن میں

اپنے جیسے تنہا ہرنوں سے محبت کرنا

اُن کے قہقہوں سے ہونٹ

اُن کی فسردگی کی کلونچ سے پلکیں گھڑنا

اُنھیں گھنٹوں چومنا

اِس سال میں نے سیکھا

کرسمس کی وحشت زدہ عمیق گھاٹی پھاندنے کی کوشش

کرنا، ناکام ہونا

اپنی اُکھڑتی سانسوں کو ریت گھڑی میں بھر کر اُسے

پھر اُلٹ دینا

اِس سال میں نے سیکھا



سانجھ

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan
Phone : +92 42 3314686276
email: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Sanjh Publications


ISBN:978-969-593-385-5
9 789695 933855
Rs:400